اشتراکی مغالطے

از جناب مولوی محمد مظہر الدین صاحب صدیقی

(یہ ایک انگریزی مضمون کا ترجمہ ہے جو صاحب مضمون کے مزید اضافے اور تشریحات کے بعد شائع کیا جا رہا ہے)

اشتراکیوں کا خیال ہے کہ کسی نظامِ فکر کے مختلف اجزائے ترکیبی کا باہمی ربط و تطابق اُس کی صداقت کا معیار ہوا کرتا ہے۔ انھیں اس بات پر فخر ہے کہ اشتراکیت عقائد و نظریات کا ایک مربوط نظام ہے جس کا ہر جزو دوسرے جز سے ہم رشتہ اور ہم آہنگ ہے۔ لیکن جس شخص میں ذکاوتِ طبع کا ذرا سا بھی مادہ موجود ہے، وہ اشتراکی نظامِ فکر میں متعدد رخنوں کا سراغ لگا سکتا ہے بشرطیکہ وہ اشتراکیوں کی طرح معاشرتی اور اقتصادی تعصبات سے مغلوب نہ ہو۔ علاوہ ازیں اگر اس اشتراکی دعوے کو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اشتراکی نظامِ فکر کے ترکیبی عناصر ایک داخلی ربط و تسلسل کے حامل ہیں، تب بھی محض یہ چیز اشتراکیت کے برحق ہونے کا کافی ثبوت نہیں ہو سکتی ہے۔ کیونکہ کسی نظام کے اجزائے فکر کی باہمی مطابقت صداقت کا واحد معیار نہیں ہے۔ اگر کسی شخص کی دروغ بافیوں میں داخلی ربط و تسلسل پایا جائے تو محض اس ربط کی بنا پر اس کی دروغ بیانیاں سچائیاں نہیں بن جائیں گی۔

تاہم جہاں تک داخلی ربط اور تطابقِ فکر کا سوال ہے، اس پہلو سے بھی اشتراکیت علمی تنقید کی تحمل نہیں ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر تاریخ کی مادی تعبیر کو لیجیے، جو قصرِ اشتراکیت کا سنگِ بنیاد ہے۔ اشتراکی کہتے ہیں کہ تمام اخلاقی تصورات اور علمی نظریات زندگی کے معاشرتی ماحول اور خارجی واقعات سے پیدا ہوتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر اخلاقی افکار اور ذہنی تخیلات ان خارجی حالات سے الگ ہو کر کوئی حیثیت نہیں رکھتے، جن میں کہ وہ رونما ہوتے ہیں۔ اس مفروضہ کی بنا پر تمام صداقتیں اپنے اپنے دور کے لحاظ سے اضافی قرار پاتی ہیں۔ یعنی ہر صداقت جس دور کے خارجی حالات سے وجود پذیر ہوتی ہے، اس دور کے ختم ہو جانے پر ساقط الاعتبار ہو جاتی ہے۔ ایسی کوئی صداقت نہیں ہے اور نہ ہو سکتی ہے جو ہر زمانہ کے لیے یکساں طور پر صحیح ہو اور ابدی ہونے کا دعویٰ کر سکے۔ اب اگر اشتراکیوں کا یہ نظریہ تسلیم کر لیا جائے کہ انسانی افکار و تخیلات اور اخلاقی اقدار (Moral Values) خارجی احوال و واقعات کا عکس ہوتے ہیں۔ تو یہ بات مطلق سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ افکار و اقدار پر نیک و بد، محمود و مذموم یا حق و باطل ہونے کا اطلاق کیونکر کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ جو چیز خارجی حالات سے میکانکی طور پر پیدا ہو جاتی ہے اور ہمارے ارادہ و اختیار کے بغیر ہم پر زندگی بھر مسلط رہے وہ بری یا اچھی کیسے کہلائی جا سکتی ہے۔ روحانی تصورات اور اخلاقی افکار بے نتیجہ اور بے قیمت ہیں اگر وہ ہماری مادی زندگی اور خارجی ماحول سے میکانکی طریقہ پر وجود میں آتے ہیں۔ کیونکہ ایسی صورت میں ہماری عملی زندگی سے ان کا کوئی تعلق باقی نہیں رہتا ہے اور نہ واقعات و حوادث کی تشکیل یا انسانی اعمال کی صورت گری میں ان کا کوئی حصہ ہو سکتا ہے۔ جس طرح ہم اپنے گرد و پیش اور اپنے خارجی ماحول کے اثرات سے بچ نہیں سکتے ہیں۔ اسی طرح ہم اپنے عقائد

وافکار اور اخلاقی تصورات پر عمل پیرا ہونے کے لیے بھی مجبور ہیں۔ کیونکہ وہ بھی ہمارے خارج اور ہمارے گرد و پیش سے وجود میں آتے ہیں۔ اس مفروضہ پر اخلاقی تصورات و اقدار کا وجود تو تسلیم کیا جا سکتا ہے لیکن اُن کی اخلاقی اور عملی قدر و قیمت کا انکار لازم آتا ہے۔ نیز اس استدلال کی بنا پر ہر قسم کے معاشرتی مظالم، سیاسی جبر اور معاشی استحصال کو جائز ٹھیرایا جا سکتا ہے۔ اگر انسان خارجی احوال اور گرد و پیش کے اثرات کا مجبور بندہ ہے اور اس کی ذہنیت و سیرت بالکلیہ خارجی اثرات سے تشکیل پاتی ہے۔ جن پر اسے کسی طرح کا اختیار یا قدرت نہیں ہے۔ تو پھر سرمایہ دار اپنی معاشی لوٹ کھسوٹ، سامراج کے نمائندے اپنے سیاسی ظلم و ستم اور فاسسطی آمر اپنے جابرانہ طرزِ حکومت پر اسی طرح مجبور ہیں جس طرح اشتراکی حضرات اپنی انقلاب انگیزی اور مفسدہ پردازی پر اور حیوانات اپنی بہیمانہ سرشت پر۔ کائنات کا ہر ذرہ مقہور و مجبور ہے اور انسانی ارادہ و اختیار ایک زعم باطل ہے۔ جب ہر طبقہ اور ہر گروہ خارج کا بے بس آلۂ کار ٹھیرا تو اس کی برائیوں اور ناانصافیوں کی ذمہ داری اس پر کیونکر عائد کی جا سکتی ہے۔ یہ سارا ظلم و فساد اس عملِ ارتقاء (Evolutionary process) اور تاریخی وجوب (Historical Necessity) کے تحت رونما ہو رہا ہے جس کے نام پر اشتراکی حضرات اپنی تحریک چلا رہے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر اشتراکی تحریک کامیاب بھی ہو جائے تو اس کی کامیابی حق و صداقت کی کامیابی نہیں بلکہ زور و قوت کی کامیابی ہو گی۔ کیونکہ حق و صداقت کا اطلاق ان اعمال و افکار پر نہیں کیا جا سکتا ہے جو انسان سے اضطراراً بلا اختیار و ارادہ اور خارجی ماحول کے دباؤ سے سرزد ہوں۔ خیر و شر اور حق و باطل کے تصورات انسانی اختیار اور ارادہ کے وجود کو مستلزم ہیں۔ جو انسان خارجی ماحول اور ارتقائی عمل کا غلام ہو اس کے لیے نہ حق و صداقت کوئی چیز ہو سکتی ہے اور نہ عدل و انصاف کوئی معنی رکھتا ہے۔ جو کچھ ہے، ہے، خواہ وہ ظلم ہو یا عدل، مساوات ہو یا نامساوات۔ اس کے سوا نہ کچھ ہو سکتا ہے اور نہ ہو سکتا تھا۔ انسانی تاریخ میں وجوب (necessity) ہی وجوب ہے۔ امکان (possibility) کا نام نہیں ہے۔

اب آیئے ذرا دیر کے لیے ہم اس نظریے کو خود تاریخ کی مادی تعبیر پر چسپاں کر کے دیکھیں۔ دعویٰ یہ ہے کہ انسانی افکار و تخیلات اور علمی نظریات معاشرتی ماحول اور خارجی احوال سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور ان کی صداقت اس معنی کر کے اضافی ہوتی ہے کہ جب وہ دور ختم ہو جاتا ہے جس کے مادی اور معاشرتی احوال نے ان نظریات و افکار کو پیدا کیا تھا، تو ان افکار و نظریات کی صداقت اور سودمندی بھی ضائع ہو جاتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ تاریخ کا مادی نظریہ یعنی یہ دعویٰ کہ افکار و نظریات خارجی ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں، کن خارجی حالات اور کس معاشرتی ماحول میں پیدا ہوا تھا۔ مفروضہ بالا کے تحت تاریخ کی مادی تعبیر کا یہ نظریہ اُن احوالِ خارجی اور اس سیاسی اور معاشرتی ماحول سے پیدا ہوا تھا جس میں مارکس اور اینجلس نے زندگی بسر کی اور جس میں اُن کی ذہنی نشو و نما ہوئی۔ چونکہ اُس زمانے کے خارجی حالات اِس وقت موجود نہیں ہیں اور کارل مارکس کے عہد سے دو تین صدی پیشتر یقیناً ان حالات کا کوئی وجود نہ تھا۔ اس لیے اس مفروضہ اور اس نظریے کی بنا پر ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ عہد مذکور یعنی انیسویں صدی کے قبل اور اس کے بعد جو واقعات پیش آئے ان کی تعبیر اس طرح نہیں کی جا سکتی ہے جس طرح اشتراکی حضرات ان کی عموماً تعبیر کیا کرتے ہیں۔ تاریخی واقعات کی توجیہ کا یہ طریقہ صرف انیسویں صدی کے لیے صحیح ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اسی صدی کے سیاسی اور معاشی حالات اس علمی نظریہ کی پیدائش کا سبب ہوئے تھے۔ اور اب جب کہ وہ حالات ختم ہو چکے ہیں، اس نظریہ کی صداقت بھی ساقط ہو گئی ہے۔ ماضی اور حال کے جملہ واقعات کی تعبیر و توجیہ اس نقطۂ نظر سے کرنا خود مارکس کے اس بنیادی مفروضہ پر ظلم کرنا ہو گا کہ علمی نظریات اور

اخلاقی تصورات خارجی ماحول کا عکس ہوا کرتے ہیں۔ اس کے باوجود اشتراکی حضرات قدیم اور جدید تاریخ کی توجیہ اسی مادی نقطۂ نظر سے کرتے ہیں جو صرف اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے حالات سے وجود پذیر ہوا تھا۔ یہ عقیدہ رکھنے کے باوجود کہ کوئی صداقت ابدی اور عالمگیر نہیں ہے وہ تاریخ کی مادی تعبیر کو ایک عالمگیر اور ابدی صداقت کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں اور تاریخ کے ہر دور پر اس کو بلا تکلف چسپاں کر دیتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر تضاد خیال کی اور کیا مثال ہو سکتی ہے۔

اشتراکیت کے نظریات میں صریح تناقض اور عدم تطابق کا ایک دوسرا ثبوت اس کا وہ رویہ ہے جو اس نے مذہب کے متعلق اختیار کیا ہے۔ اشتراکیت مذہب کی شدید دشمن ہے۔ اشتراکی مفکرین کے نزدیک مذہب ہمیشہ ظالموں اور جفا کاروں کا آلۂ کار رہا ہے۔ اس نے ہمیشہ فرماں روا طبقے کو ظلم و ستم، ناانصافی اور معاشی استحصال میں مدد پہنچائی ہے۔ مذہب ان کے نزدیک عوام الناس کے لیے افیون ہے۔ یہ خیال بنیادی طور پر لغو اور مہمل ہے۔ یا تو اس کے پیش کرنے والے قطعی طور پر مذہب کی تاریخ سے ناواقف ہیں، یا پھر وہ واقعات کی صورت کو اپنی خواہشات کے مطابق عمداً مسخ کر کے غلط طریقے سے پیش کرتے ہیں۔ یہ اشتراکیت پسندوں کا ایک عجیب مشغلہ ہے۔ پوری تاریخ ان کی اس غلط بیانی کی تردید کرتی ہے۔ تاریخ میں جہاں کہیں کسی دینی تحریک کی ابتدا ہوئی ہے اس نے ہمیشہ مظلوم انسانوں کا ساتھ دیا ہے۔ ظالم، غاصب اور ذاتی اغراض و منافع کو پیش نظر رکھنے والے ہمیشہ مذہب کے شدید ترین دشمن رہے ہیں۔ انبیاء کو جو کفار کی طرف سے ایک عام طعنہ دیا جاتا تھا وہ یہ تھا کہ دنیوی وجاہت کا مالک کوئی انسان تمہارے ساتھ نہیں ہے، تمہارے متبعین سب کے سب ایسے ہیں جنھیں سوسائٹی میں کوئی قدر و منزلت حاصل نہیں۔ ان کے اندر صحیح قوت فیصلہ ہی موجود نہیں ہے۔ قرآن نے انہی کے قول کو اس طرح نقل کیا ہے:۔

مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ۔ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ۔

ہم نہیں پاتے تم کو مگر اپنے ہی جیسا انسان اور ہم نہیں دیکھتے کہ تمہاری پیروی کی ہو مگر ان لوگوں کو جو ہم میں کمینے ہیں بے سمجھے بوجھے اور تم کو ہم پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔

قریش اسی لیے آخر دم تک مسلمانوں سے برسرِ پیکار رہے کہ اسلام اس معاشرتی اور سیاسی تفوق کو مٹا رہا تھا جو انھیں معاشرے میں حاصل تھا۔ چھٹی صدی عیسوی میں جزیرۃ العرب کے حقوق یافتہ طبقات اسلامی تحریک کی ترقی سے خائف و ہراساں تھے۔ اسلام کی فتح دراصل مساوات کی فتح تھی اور یہی اس کی فوری ترقی اور حیرت انگیز کامرانی کی بہت بڑی وجہ ہے۔ انسان کے لیے افیون ہونا تو درکنار، اسلام تاریخ میں ایک عظیم ترین انقلابی قوت ہے جس کے سامنے فرانسیسی انقلاب یا روس کا اشتراکی انقلاب بالکل ہیچ نظر آتے ہیں۔ روس کا انقلاب ایک ایسے ملک میں برپا ہوا جو آبادی کی کثرت، رقبہ کی وسعت اور قدرتی وسائل کی فراوانی کے لحاظ سے دنیا کے تمام ملکوں پر فائق ہے۔ اس کے باوجود ایک طاقت ور دشمن سے اپنے اولین تصادم کے موقع پر وہ اپنے خول میں سمٹ کر رہ گیا اور اس کو محض اپنی حفاظت اور بقا کے لیے دوسروں کی مدد کا دست نگر ہونا پڑا۔ لیکن اسلامی تحریک جملہ تمدنی موثرات سے دور، ایک خشک، بنجر، بے برگ و گیاہ اور قلیل آبادی رکھنے والے خطۂ زمین سے اٹھی اور فتحمندانہ شان کے ساتھ پھیلتی اور وسیع ہوتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ ہندوستان کی سرحدوں سے لے کر بحر اوقیانوس کے سواحل تک، ایشیا اور افریقہ کا بیشتر حصہ اس کے حلقۂ اقتدار میں آگیا۔ اور یہ سب کچھ اُس زمانہ میں وقوع پذیر ہوا جب کہ ذرائع آمد و رفت کی رفتار نہایت سست

تھی۔ جب کہ سٹیم انجن اور دخانی جہازوں کا نام ونشان تک نہ تھا۔ موٹر کار اور ہوائی جہاز کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ روسی انقلاب کو اسلامی انقلاب کے مقابلہ میں پیش کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے سورج کو چراغ دکھانا۔ اسلام نے اپنے دائرے میں داخل ہونے والی قوموں کی زندگیوں میں جو عظیم الشان تغیر پیدا کیا اس کا اندازہ کیجیے۔ فارس، مصر، شام اور الجیریا کے دور افتادہ خطوں میں رہنے والوں کو ہمیشہ کے لیے اسلام نے ایک مستقل طرز زندگی عطا کیا۔ گزشتہ بارہ صدیوں کے انقلابات، حتیٰ کہ مغرب کی مادی تہذیب کی نظر فریب درخشانی بھی اُن کے اخلاقی اقدار اور دینی نقطۂ نظر کو تبدیل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ اتنے وسیع الاثر اور دور رس نتائج رکھنے والے انقلاب سے اشتراکی انقلاب کو کیا نسبت ہو سکتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ بسا اوقات معاشی مقاصد کے لیے مذہب کا ناجائز اور ناروا استعمال ہوتا رہا ہے۔ لیکن اس میں مذہب کا کیا قصور ہے؟ افکار ونظریات کا کوئی سا مجموعہ، خواہ وہ دینی ہو یا غیر دینی، پست اور ذلیل مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہی الزام خود اشتراکیوں کے خلاف عائد کیا جا سکتا ہے۔ سوسائٹی کے وہ تمام عناصر جو سماجی اور مذہبی قیود سے آزاد ہونا چاہتے ہیں جن میں متمول طبقوں کے وہ افراد بھی شامل ہیں جو آزادانہ تن پروری اور تعیش پرستی کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں اور وہ تعلیم یافتہ نوجوان بھی شامل ہیں جو کہ ناقص تعلیم و تربیت کی وجہ سے ہر قسم کی اخلاقی بندشوں کو توڑ دینا چاہتے ہیں، اشتراکیت کے علمبردار نظر آتے ہیں۔ اور یہ محض اس لیے کہ اشتراکیت تمام مذہبی اور اخلاقی قیود کی نفی کرتی ہے اور اخلاق کی بنیاد محض مصلحت پرستی پر قائم کرتی ہے۔ اور اشتراکی بنا انفرادی اور شخصی اصلاح کی کوششوں اور اس کی لازمی مشقتوں سے انسان کو رہائی دیتا ہے۔ ان اشتراکیوں کا دعویٰ ہے کہ دنیا کے تمام مفاسد سرمایہ داری کی پیداوار ہیں اور اصلاح نفس کی حقیقت ایک خام خیالی یا خود فریبی سے زیادہ کچھ نہیں۔ جب سرمایہ دارانہ نظام کا خاتمہ ہو جائے گا اُس وقت معجزانہ طور پر تمام افلاس، بُرائی اور بے انصافی دنیا سے مٹ جائے گی۔ اشتراکی جنت میں اخلاقی قیود کے آثار باقیہ کو مکمل طور پر صفحۂ ہستی سے محو کر دیا جائے گا۔ اور انسان کو آزادی اور بے لگامی کی وہ بہشت حاصل ہو جائے گی جس کی نعمتوں سے جنگل کے شیر اور سمندر کی مچھلیاں لذت اندوز ہیں۔ اس طرح اشتراکیت سے دین اور اخلاق کے وہ دشمن ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں جنھیں نیکی سے اس لیے نفرت ہے کہ ان میں نیک اور شریف بننے کی ہمت اور سکت باقی نہیں ہے۔ جو نظام اخلاق سے اس لیے بیزار ہیں کہ وہ قدم قدم پر ان سے اصلاح اخلاق کی دائمی جد و جہد کا مطالبہ کرتا ہے۔

اشتراکیت کے نظریات میں صرف ایک صداقت ہے جو کہ بیک وقت اسکی زندگی اور قوت کا باعث ہے۔ وہ یہ کہ کوئی معاشرہ زندہ نہیں رہ سکتا، ترقی اور ارتقاء کا تو ذکر کیا ہے، جو اپنے افراد کی ایک کثیر تعداد کو ان وسائل حیات سے محروم رکھے جن سے کم از کم ایک اوسط درجے کی آسائش کی زندگی بسر کی جا سکے۔ نیز یہ کہ اگر سوسائٹی میں آپ مذہب، اخلاق اور دیگر اعلیٰ اقدار کی کارفرمائی چاہتے ہیں تو آپ کو طبقاتی اقتدار ختم کرنا ہوگا اور ایک ایسے اجتماعی نظام کے قیام کی کوشش کرنی ہوگی جو سوسائٹی کے ہر مرد و زن کے لیے کم از کم وہ ضروریات زندگی فراہم کرنے کا ذمہ لے جن سے جسم و جان کا رابطہ باسانی قائم رکھا جا سکے۔ یہ ایک ایسی صداقت ہے جسے ہر صحت مند اور ترقی پذیر معاشرے نے تسلیم کیا ہے۔ جہاں اسے تسلیم نہیں کیا گیا اس کا نتیجہ باہمی استحصال، ہلاکت اور تباہی کی صورت میں نمودار ہوا ہے۔ سوائے اس ایک نہایت اہم صداقت کے جس کی حامل تنہا اشتراکیت ہی نہیں، تمام فلسفۂ اشتراکیت لغویات کا ایک انبار اور جزوی صداقتوں، غلط بیانیوں اور دروغ گوئیوں کا ایک طوفان ہے جس میں تاریخ انسانی کے واقعات کو مسخ کر کے اور ان میں جا بجا بری طرح قطع و برید کر کے پیش کیا گیا ہے۔